International Research Journal on Islamic Studies (IRJIS)
ISSN 2664-4959 (Print), ISSN 2710-3749 (Online)
Journal Home Page: https://www.islamicjournals.com
E-Mail: tirjis@gmail.com / info@islamicjournals.com
Published by: "Al-Riaz Quranic Research Centre" Bahawalpur

اسلامی سیاسی فکر میں اختیارات کی شراکت کا تصور: ایک تجزیاتی مطالعہ

The Concept of Power-Sharing in Islamic Political Thought: An Analytical Study

1. Ghulam Muhammad Abdul Rauf
PhD Scholar, Department of Islamic Studies,
The Islamia University of Bahawalpur, Punjab, Pakistan
Email: ghulammuhammad8262@gmail.com

2. Dr. Muhammad Asif
Assistant Professor, Department of Islamic Studies,
The Islamia University Bahawalpur, RYK Campus, Punjab, Pakistan
Email: dr.masif@iub.edu.pk
ORCID ID: https://orcid.org/0000-0001-5138-3556

To cite this article: Ghulam Muhammad Abdul Rauf & Dr. Muhammad Asif. 2025. "اسلامی سیاسی فکر میں اختیارات کی شراکت کا تصور: ایک تجزیاتی مطالعہ: The Concept of Power-Sharing in Islamic Political Thought: An Analytical Study". International Research Journal on Islamic Studies (IRJIS) 7 (Issue 1), 84-102.

Journal	International Research Journal on Islamic Studies Vol. No. 7 || January - June 2025 || P. 84-102
Publisher	Al-Riaz Quranic Research Centre, Bahawalpur
URL:	https://www.islamicjournals.com/urdu-7-1-7/
DOI:	https://doi.org/10.54262/irjis.07.01.u7
Journal Homepage	www.islamicjournals.com & www.islamicjournals.com/ojs
Published Online:	30 June 2025

License:	This work is licensed under an Attribution-ShareAlike 4.0 International (CC BY-SA 4.0)

Abstract:

This analytical study explores the concept of power-sharing in Islamic political thought through an exegetical examination of the Quran (via a interpretive analysis of the verses in Surah Yusuf), the Prophetic Sunnah (the practical examples of the Migration to Abyssinia and the Constitution of Medina), the historical period of the Rightly Guided Caliphs (based on the principles of Shura, accountability, and popular consent), and the ideas of contemporary Muslim scholars such as Rashid al-Ghannushi, Yusuf al-Qaradawi, Wahbah al-Zuhayli, Muhammad Hashim Kamali, and Abul A'la Maududi, investigating the scriptural legitimacy and modern application of this theory. The research reveals that the Quran and Sunnah provide legitimacy for sharing power with non-Islamic governments based on justice and public interest, while the Constitution of Medina established a clear tradition of political partnership grounded in mutual equality and collective justice in a multi-religious society.

Although this was reflected practically during the Rashidun Caliphate in the form of Shura and accountability, the concept did not find a systematic form in later juristic traditions. However, the aforementioned contemporary scholars have revived this concept of power-sharing through renewed ijtihad, proving that it is, in fact, a requirement of the Maqasid al-Shari'ah (Objectives of Islamic Law) and Islamic ethics.

Keywords: Power-sharing, Islamic political thought, Shura, Maqasid al-Shari'ah, Contemporary ijtihad

اکیسویں صدی میں سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کے انقلاب نے دنیا کو ایک عالمی بستی میں بدل دیا ہے، جہاں جغرافیائی سرحدوں کی معنویت کم اور اقوام کا باہمی انحصار بڑھ گیا ہے۔ اس تناظر میں رواداری، شمولیت اور اختیارات کی منصفانہ تقسیم پائیدار ریاستی نظم کی بنیاد بن چکی ہے۔ چنانچہ جدید دنیامیں یہ سوال از سرِنو ابھرا ہے کہ اسلام اجتماعی اختیارات کی شراکت کو کس حد تک اصولی طور پر قبول کرتا ہے۔

اسلامی سیاسی فکر کی اولین بنیاد ہمیں میثاقِ مدینہ میں ملتی ہے۔ ایک ایسا معاہدہ جس نے مختلف قبائل اور مذاہب کے گروہوں کو ایک ریاستی نظم میں جمع کیا، جہاں سب کو قانون کی بالادستی تسلیم کرنا پڑی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شراکتِ اقتدار کو مذہبی شناخت سے بالاتر ہو کر اجتماعی عدل اور مساوات کے اصول کے طور پر پیش کیا گیا۔ یوں اسلامی روایت میں طاقت کی تقسیم اور اجتماعی شرکت کوئی بیرونی تصور نہیں بلکہ ایک داخلی اخلاقی و فقہی اصول ہے۔

تاہم خلافتِ راشدہ کے بعد فقہی روایت میں یہ تصور ادارہ جاتی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اموی وعباسی ادوار میں سیاسی غلبہ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا، اس لیے فقہانے غیر مسلم رعایا کے لیے زیادہ تر حقوق و فرائض کی وضاحت پر توجہ دی، نہ کہ اختیارات کی شراکت پر۔ الماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' جیسے متون اگرچہ اسلامی حکومت کے ڈھانچے پر روشنی ڈالتی ہیں، مگر وہاں اقتدار کی تقسیم یا شراکت کا جامع نظریہ غیر موجود رہا۔

مسلمانوں کے ذہن میں غالب قوم ہونے کا احساس اس امر کا باعث بنا کہ وہ اقلیتی یا شراکتی سیاست کے امکانات پر غور نہ کر سکے۔ لیکن جب نو آبادیاتی نظام کے بعد مسلم ریاستیں وجود میں آئیں، تو انہیں جدید آئینی ڈھانچوں کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی مشکل درپیش ہوئی۔ نتیجتاً اُن کی سیاسی ساخت زیادہ تر مغربی آئینی و ادارہ جاتی ماڈل سے ماخوذ ہوئی، جس میں شہری برابری اور عوامی رضامندی کو مرکزیت حاصل تھی۔

فقہی روایت کے اس خلا نے معاصر مفکرین کو نئے اجتہاد پر آمادہ کیا۔ راشد غنوشی نے جمہوری عمل اور عوامی شمولیت کو اسلامی اصولِ شورا کی جدید تعبیر قرار دیا، جبکہ فضل الرحمن نے نصوص کی تاریخی قرأت اور ''ڈبل موومنٹ ہرمینیوٹکس'' کے ذریعے شریعت کو زمانی و مکانی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے کی راہ دکھائی۔ ان دونوں کی فکر سے یہ نتیجہ ابھرتا ہے کہ اسلام اقتدار کے مخصوص سانچے نہیں بلکہ اخلاقی اصولوں اور عدلِ اجتماعی کے دائرے میں شراکتِ اقتدار کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔

یوں اسلام میں اختیارات کی شراکت کا تصور کوئی جدید اجنبی فکر نہیں بلکہ اس کی جڑیں عہدِ نبوی ﷺ کی عملی سیاست میں پیوست ہیں، جنہیں عصرِ حاضر کے بدلتے ریاستی اور آئینی تناظر میں نئے اجتہادی شعور سے از سرِنو منضبط کرنے کی ضرورت ہے۔

شامی فقیہ وَهْبَةُ الزُّحَيْلِيّ نے بھی اقلیتوں اور غیر اسلامی ماحول میں مسلمانوں کے فقہی احکامات پر نئے بیانیے فراہم کرنے کی کوشش کی؛ اس نے کلاسیکی فقہی تقاضوں کو معاصر بین الاقوامی اور معاشرتی حالات کے تناظر میں پڑھنے کی راہ دکھائی اور بعض معاملات میں سابقہ اجتہادی حدود کو وسعت دی۔

علامہ یوسف القرضاوی (1926ء–2022ء) نے بھی طویل عرصے تک اس نکتے پر زور دیا کہ مسلمانوں کی سیاسی شمولیت، ہمہ جہتی شہری ذمہ داری اور غیر مسلم معاشروں میں وفاداری کے جواز کو قرآن وسنت کے عمومی مقاصد (مقاصدِ شریعت) کی روشنی میں سمجھا جائے۔ان کی فتاویٰ نگاری اور یورپی مسلم برادری کے بارے میں مشورے اس پہلو پر مرتکز رہے کہ اسلام مجموعی بھلائی، عدل و مساوات اور انسانی وقار کے اصولوں کے تحت غیر مسلم رضاکارانہ نظام کا حصہ بننے کی اجازت دیتا ہے۔اسی نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے جان کین (John Keane پیدائش 1949ء)، جو آسٹریلوی نژاد جرمن سکالر اور جمہوریت کے ممتاز محقق ہیں، اپنے مضمون "Power-Sharing Islam?" میں ایک عقلی مؤقف پیش کرتے ہیں کہ دنیا کے مسلمانوں کا تقریباً ایک تہائی حصہ ایسے ممالک میں رہتا ہے جہاں وہ آبادی کی اکثریت بننے کی امید نہیں رکھ سکتے۔ایسے تناظر میں، مثلاً بھارت میں، اسلام پسندوں کے پاس یہی واحد متبادل ہے کہ وہ سب کے لیے رواداری، شہری و سیاسی آزادیوں کے اصولوں کو اپنائیں۔ بصورتِ دیگر، وہ اپنی سماجی اور سیاسی ساکھ کو خود نقصان پہنچاتے ہیں۔ ([1])

یہ فکری خطوط محض تھیوری نہیں بلکہ قرآنی نمونوں سے بھی تقویت پاتے ہیں؛ خاص طور پر سورۃ یوسف میں حضرت یوسفؑ کا غیر مسلم فرمانروا کے دربار میں مالی وانتظامی ذمہ داری سنبھالنے کا واقعہ ایک قابلِ غور اخلاقی وسیاسی سبق دیتا ہے: وہ نہ صرف غیر مسلم دربار میں خدمت کرتے ہیں بلکہ حکومتی نظم وعدل کو نافذ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں ۔

معاصر مفکرین کا مشترکہ محور یہ ہے کہ تاریخی فقہی خامیاں اور نوآبادیاتی/آئینی خلا اجتہاد، مقاصدِ شریعہ اور سیاسی فلسفہ (justice, equality, public interest) کے تناظر میں حل ہو سکتے ہیں؛ اس راہ میں شواہدِ نصّی، فقہی اصول اور معاصر سیاسی نظریات باہم مل کر اسلامی شراکتِ اقتدار کا ایک منطقی اور اخلاقی فریم ورک فراہم کرتے ہیں۔اسلامی شریعہ کا واحد مقصد ہی انسانیت کی فلاح اور دفع مضرت ہے۔امام شاطبیؒ بجا فرماتے ہیں: ''ہم نے شریعت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسے صرف انسان کے مفاد کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔([2])

معاصر اسلامی سیاسی فکر میں عمومی رجحان یہ ہے کہ امام شاطبیؒ کے نظریۂ مقاصدِ شریعت کو بنیاد کے طور پر اپنایا جائے، یعنی دین کا نزول صرف انسان کی دنیاوی اور آخرت کی ضروریات و مفادات کی تکمیل اور حفاظت کے لیے ہوا۔اس نقطۂ نظر کے مطابق شریعت کو مسلم معاشرے کے نئے اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے ایک عمومی فریم ورک کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔اس فریم ورک کے اندر، دین کی تفصیلات بنیادی اصولوں کی شاخوں کے طور پر اپنی مناسب جگہ حاصل کرتی ہیں، تاکہ ہر مسئلے پر ایک متوازن اور عملی رہنمائی فراہم کی جا سکے۔اس نظریہ کے تحت نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانیت کو درپیش جدید چیلنجز اور ضروریات کے لیے قابلِ اطلاق حل تلاش کیے جا سکتے ہیں، جو ان کی دنیاوی فلاح اور آخرت کی کامیابی دونوں کو یقینی بنائیں۔

تیونس کے معروف اسلامی مفکر، سیاست دان راشد غنوشی (Rached Ghannouchi) اپنے ایک مضمون'' The Participation of Islamists In A Non-Islamic Government " میں وہ قرآن کریم اور سنت نبوی میں سے کئی ایک شواہد کا حوالہ دیتے ہیں اور فقہی علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اگرچہ اسلامی ریاست مسلمانوں کا طویل مدتی ہدف ہے، لیکن کچھ مخصوص حالات میں غیر اسلامی حکومت میں شراکت واحد قابلِ عمل اختیار ہوسکتی ہے۔([3])

---

[1]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam, London: Liberty for Muslim World Publications, 1993. P. 23
[2]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam, P. 53
[3]- Ibid. P. 54

عصری مفکرین تکثیری سماج میں اختیارات کی شراکت داری کے حوالے سے سورۂ یوسف کی آیات 54تا57 سے رہنمائی لیتے ہیں۔ان آیات کی مختلف مفسرین نے اپنی اپنی فکر کے مطابق شرح کی ہے۔قرآن مجید میں سورۂ یوسف کی آیات 54تا57 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ○قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ○وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاءُۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ○وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾(4)

اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے لیے خاص کرلوں، پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانتدار ہے۔

اس نے کہا مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر کردے، بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں۔

اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچادیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور یقیناً آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔

عصر جدید کے مفسر مولانا مودودی کے نزدیک یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "مجھے خزانے کا نگران بنادیجیے" کسی دنیاوی عہدے کی خواہش یا بادشاہ کی ملازمت کے لیے محض درخواست نہ تھی۔ یہ اس عظیم جدوجہد کی آخری کڑی تھی جو یوسف نے برسوں کی آزمائشوں، صبر، اور اخلاقی بلندی کے ذریعے مصر میں ایک نئے نظام کی راہ ہموار کرنے کے لیے کی تھی۔ان کا یہ قدم اس بات کی علامت تھا کہ حالات اب اس قدر پختہ ہوچکے ہیں کہ اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کے ساتھ ہی پورے ملک کا نظام بنیادی تبدیلی کے لیے تیار ہے۔

مولانا مودودی بتاتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اقتدار کی خواہش ذاتی مفاد کے لیے نہیں کی تھی۔اگر وہ واقعی محض ایک غیر اسلامی بادشاہ کے وزیر بننے پر راضی ہوجاتے، تو یہ ان کی نبوی دعوت کے بالکل منافی ہوتا۔ کیونکہ وہ قید خانے میں بارہا اعلان کرچکے تھے کہ اصل اقتدار صرف اللہ کا ہے، اور بادشاہت یا بت پرستی انسانوں کی اختراع ہے۔اگر وہ انہی اصولوں کی نفی کرتے ہوئے ایک غیر الٰہی نظام کے خادم بن جاتے، تو ان کی سچائی مشکوک ٹھہرتی۔

اسی لیے مودودی یہ مؤقف پیش کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اقتدار اسی نیت سے قبول کیا کہ وہ اللہ کے دین کو نافذ کریں، عدل قائم کریں اور اخلاقی و تہذیبی بنیادوں پر پورے نظام کو نئی جہت دیں۔یہ اقتدار دراصل ان کے اخلاقی اور فکری غلبے کا فطری نتیجہ تھا، نہ کہ دنیاوی عہدے کی دوڑ۔ مصر کے بادشاہ سے لے کر عام رعایا تک ہر شخص یوسف کی راستبازی، امانت، ضبطِ نفس اور غیر معمولی بصیرت کا قائل ہوچکا تھا، اور یوں پورے ملک نے متفقہ طور پر ان کی قیادت کو قبول کیا۔

مولانا مودودیؒ اس تاثر کو بھی رد کرتے ہیں کہ یوسف کو صرف خزانے یا خوراک کی وزارت ملی تھی۔قرآن، بائبل اور تلمود کے مطابق، یوسف کو مصر میں مطلق اقتدار حاصل تھا۔ وہ عملی طور پر پورے ملک کے حاکم تھے، اور بادشاہ صرف نام کا سربراہ رہ گیا تھا۔یوسف کا اپنے والدین کو تخت پر بٹھانا اور ان کا قول "اے رب! تونے مجھے بادشاہی بخشی" اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

4- Aḯqurãạ^n 12: 54tā 57

مولانا مودودی مزید ایک اہم نکتہ اٹھاتے ہیں: بعد کے دور میں بعض یہودی مفسرین اور زوال پذیر علماء نے سورۃ یوسف کی ان آیات کو اس طرح سمجھایا جیسے وہ غیر اسلامی حکومت کی خدمت کر رہے تھے۔ یہ دراصل اپنی پستی کو جواز دینے کا ایک طریقہ تھا تاکہ انبیاء کو بھی اپنے درجے پر لا کھڑا کریں۔ لیکن یوسف کی اصل سیرت یہ بتاتی ہے کہ ایک نبی کبھی باطل نظام کا خادم نہیں بنتا، بلکہ اپنی حکمت، کردار اور اخلاقی طاقت سے پورے نظام کو الٰہی اصولوں کے مطابق ڈھالتا ہے۔

اسی سے مولانا مودودی ایک بڑا سبق نکالتے ہیں: اگر ایک تنہا مؤمن اپنے ایمان، سچائی اور حکمت پر ثابت قدم ہو تو وہ بغیر ہتھیاروں کے بھی ایک پورے ملک میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی یہ پیغام دیتی ہے کہ اقتدار کی اصل غایت اللہ کے دین کو قائم کرنا اور عدل و حق کو غالب کرنا ہے، نہ کہ دنیاوی مرتبہ یا عہدہ حاصل کرنا۔([5])

مولانا مودودی کے اس مؤقف سے بعض معاصر اہلِ علم، خصوصاً سلطان احمد اصلاحی نے اختلاف کیا ہے۔ اصلاحی کے مطابق، سورۂ یوسف کی روایت بنیادی طور پر ایک کثرت پسندانہ (pluralistic) نقطۂ نظر پیش کرتی ہے اور اس میں اقتدار یا ریاستی نظام کے قیام کا مقصد بیان نہیں کیا گیا۔ ان کے نزدیک، حضرت یوسفؑ کی شجاعت، دیانت اور اعتماد کی توثیق قرآن میں اس لیے آئی ہے کہ یہ اخلاقی اور عملی اقدار سب کے لیے نمونہ ہیں، نہ کہ یوسفؑ نے کسی بادشاہت یا ریاستی منصب کے ذریعے شریعت نافذ کرنے کے لیے یہ مقام اختیار کیا ہو۔

اصلاحی واضح کرتے ہیں کہ مسلمان مغربی ممالک کی سیاست اور ریاستی امور میں فعال کردار ادا کریں، مگر اس کردار کا محور اخلاقی قیادت، عدل و انصاف اور سماجی بھلائی ہونا چاہیے، نہ کہ کسی مخصوص مذہبی قانون کو جبراً نافذ کرنا۔ یہ مؤقف مولانا مودودی کے اس نقطۂ نظر سے واضح اختلاف پیش کرتا ہے، جس میں ریاستی سطح پر شریعت کے نفاذ پر زور دیا گیا ہے۔ سلطان احمد اصلاحی سورۂ یوسف کی روایات کو ایک ایسا فکری اور اخلاقی ماڈل سمجھتے ہیں جو اختلافات کو تسلیم کرنے، صلح و مفاہمت قائم رکھنے اور مختلف سماجی و ثقافتی حالات میں اخلاقی فیصلہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس روایت میں یوسفؑ کے بھائیوں کے ساتھ بردباری اور معاشرتی ہم آہنگی کے عناصر واضح ہیں، جو آج کے دور میں مسلمانوں کے لیے ایک رہنمائی کا فریم ورک فراہم کرتے ہیں کہ وہ مختلف ثقافتوں اور نظریات کے ساتھ تعامل میں اعتدال پسند اور اخلاقی رویہ اختیار کریں۔ اُنھوں نے واضح کیا کہ قرآن میں یہ ذکر کہیں موجود نہیں کہ حضرت یوسفؑ نے منصب اسی غرض سے قبول کیا کہ شریعتِ ابراہیمی نافذ کریں۔([6])

اصلاحی کی نظر میں، یوسفؑ نے باضابطہ طور پر ملک کے خزانے سنبھالنے اور اناج کے ذخائر کے انتظام کی ذمہ داری لی، تاکہ قحط کے سالوں میں عوام کو نقصان نہ پہنچے۔ ان کا یہ اقدام نہ صرف حکمت عملی کی دلیل ہے بلکہ اخلاقی بالادستی اور ذمہ داری کا عملی مظاہرہ بھی ہے۔ بادشاہ نے یوسفؑ کی اہلیت اور دیانت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں اعلیٰ مقام عطا کیا، جیسا کہ قرآن میں بیان ہے: ”یوں ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا کہ وہ جہاں چاہیں رہیں۔ ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں، اور ہم نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔“ ([7])

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اصلاحی کا نقطۂ نظر مودودی کے مؤقف سے بنیادی طور پر مختلف ہے: اقتدار کا حصول ضروری نہیں کہ صرف شریعت کے نفاذ کے لیے ہو، بلکہ حضرت یوسفؑ کے معاملے میں یہ ایک عملی، اخلاقی اور قابلیت پر مبنی فیصلہ تھا، جو کثرت پسندانہ اور حقیقت

---

[5]- Syd ạbwạlạʿly mwdwdy̰ , tfہy̰m ạḥk̲ạm ạl̊quřậna , muratãbuⁿ: ʿab̊du ạlwk̲y̰l ʿlwy̰ (lạہwr: ạdạrہ maʿārifa ạslạmy̰ , 20̃06ʾ)/ 2 412̃-

[6]- Yusuf Ali, Abdullah. The Holy Quran: Text, Translation & Commentary. Beltsville, MD: Amana Publications, 1997, 571.

[7]- Al̊qurãạˆn 12: 56

پسندانہ نقطۂ نظر سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انہی تعلیمات کے پیش نظر، عصری اسلامی مفکرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان یا غیر مسلم ماحول میں طاقت کی شراکت اس لیے ضروری ہو جاتی ہے تاکہ سماجی و سیاسی نظام کی بنیاد مضبوط کی جا سکے۔ اس طرح کی شراکت لازمی طور پر مکمل طور پر اسلامی شریعت پر مبنی نہ بھی ہو، تب بھی اسے اسلامی حکومت کی ایک بنیادی جڑ، یعنی شوریٰ یا امت (community) کی اجتماعی اتھارٹی پر مبنی ہونا چاہیے، تاکہ آمریت، غیر ملکی تسلط یا مقامی افرا تفری کے منفی اثرات کو روکا جا سکے۔ طاقت کی یہ شراکت صرف مذہبی یا سیاسی مفاد تک محدود نہیں، بلکہ یہ قومی و انسانی مفادات کے لیے بھی ضروری ہو سکتی ہے، جیسے کہ آزادی، ترقی، سماجی یکجہتی، شہری حقوق، انسانی حقوق، سیاسی کثرتیت، عدلیہ اور صحافت کی آزادی، اور مساجد و دیگر اسلامی سرگرمیوں کی آزادی کو یقینی بنانا۔ ([8])

علامہ راشد غنوشی بھی یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تفصیلی کہانی اس بات کی واضح گواہی ہے کہ ان کا طریقہ عملی، حکمت آمیز اور قابل تعریف ہے۔ جو کچھ حضرت یوسف کے ساتھ ہوا، وہ مسلمانوں کے ساتھ کہیں بھی اور کسی بھی وقت پیش آ سکتا ہے۔ اسی لیے، ایسے حالات میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر اسلامی حکومتوں کے قیام اور انتظام میں فعال کردار ادا کریں، تاکہ امت کے مفاد کی خدمت ہو اور معاشرتی برائیوں کی روک تھام ممکن بنائی جا سکے۔ ایسا نہ کرنے سے نہ صرف امت کے اہم مفادات کمزور ہوں گے بلکہ ظلم، ناانصافی اور بدعنوانی معاشرے پر غالب آ سکتی ہیں۔([9])

علامہ زمخشری نے سورۂ یوسف کی تفسیر میں یہ نکتہ نمایاں کیا کہ حضرت یوسفؑ نے اقتدار کا مطالبہ اللہ کے احکام کے نفاذ، عدل و انصاف کے قیام اور انبیاء کے مشن کی تکمیل کے لیے کیا، نہ کہ کسی دنیوی خواہش کے تحت۔ وہ جانتے تھے کہ اس فریضے کی ادائیگی ان کے سوا ممکن نہ تھی، اس لیے انہوں نے منصب صرف الٰہی مقصد اور رضا کے لیے طلب کیا۔

زمخشری اس استدلال کو مزید واضح کرتے ہیں کہ سلف صالحین نے بھی بعض مواقع پر فاسق یا باغی حکمرانوں کی جانب سے پیش کیے گئے عہدے قبول کیے، اگر ان کے ذریعے عدل کا قیام اور ظلم کا خاتمہ ممکن ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر کسی رسول یا عالم کے لیے اللہ کے کلام کے مطابق فیصلہ کرنے اور ظلم روکنے کا واحد راستہ یہ ہو کہ وہ کسی کافر یا گناہ گار بادشاہ کے زیرِ اختیار ہو، تو وہ اس اختیار سے مدد لے سکتا ہے۔"([10])

زمخشری کی رائے کے مطابق مسلمان اگر کسی غیر مسلم ریاست میں رہتے ہوں تو ان پر لازم ہے کہ آئین و نظامِ ریاست کی پاسداری کریں، تاکہ سماجی نظم، امن اور عدل قائم رہ سکے۔ یہ وفاداری محض اطاعت نہیں بلکہ مفادِ عامہ اور معاشرتی بھلائی کا تقاضا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی مثال بتاتی ہے کہ مخلص مسلمان کو منصب صرف الٰہی مقصد اور عوامی فلاح کے لیے قبول کرنا چاہیے، نہ کہ دنیوی مفاد کے لیے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم حکومت کے تحت خدمت دینی طور پر ممنوع نہیں، بشرطیکہ اس سے انصاف کا قیام اور ظلم کا خاتمہ مقصود ہو۔

ڈاکٹر کمال الہلباوی کے مطابق اسلامی فکر میں اختیارات کی شراکت بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ وسیلہ ہے۔ ایسا ذریعہ جو الٰہی پروگرام، سماجی انصاف اور انسانی صلاحیتوں کے مؤثر استعمال کو ممکن بناتا ہے۔ یہ تصور صرف مسلم معاشروں تک محدود نہیں بلکہ انسانی مساوات اور اجتماعی بہبود کے فروغ کا عالمی اصول ہے۔([11])

---

[8]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? Lon, P. 56

[9]- Ibid. P. 57

[10]-ảbū ạl̊qāsimi jāriⁿ ạllhi maḥ̊mūdi b̊n ʿumari ạlzãmakẖ̊sẖarīĩ. taf̊sīru ạl̊kasẖã̉ạfi ʿan̊ ḥaqāyỉqi ạltãn̊zīli waʿuyūni ạl̊ạảqāwīli fī wujūhi ạltã̉ạ̊wīli. ʿanīuⁿ̃ bihi wakẖaraja ạảḥādītẖuhu kẖalīla mȃ̊mūna sẖīḥaⁿạ , waʿalaẙhu taʿ̊līqāti kitābi ạl̊ạiñtiṣāfi ạlnãạṣiri ạldãyĩni ạib̊na munīri ạl̊mālikīĩ) baẙrūta: dāru ạl̊maʿ̊rifaẗi , 2009ʾ) 521 -

[11]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam, P. 145

امام فخر الدین رازی اس مسئلے میں ایک اجتہادی وحقیقت پسندانہ موقف رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک بعض حالات میں سرکاری مناصب یا اختیارات قبول کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب بھی ہو سکتا ہے، اگر اس سے عوامی مفاد کا تحفظ ہو۔ وہ حضرت یوسفؑ کی مثال سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کے امور منظم کرے اور اگر فلاحِ عامہ کا حصول کسی مخصوص وسیلے سے ممکن ہو، تو وہ اختیار بھی شرعاً درست ہے۔([12]) گویا یہ علمی نکتے سامنے آئے کہ:

- ❖ نبی پر لازم ہے کہ وہ عوام کو فائدہ پہنچائے اور نقصان سے بچائے۔ یہ عقلی اور شرعی دونوں اعتبار سے ضروری ہے۔
- ❖ اگر عوام کی فلاح صرف کسی خاص منصب یا اختیار کے ذریعے ممکن ہو، تو وہ منصب یا اختیار بھی فرض بن جاتا ہے۔
- ❖ مصری بادشاہ کی حکومت میں عہدہ قبول کرنا ہی عوام کے رزق اور حفاظت کے لیے عملی طور پر مؤثر تھا، اس لیے حضرت یوسفؑ کے لیے یہ منصب اختیار کرنا ضروری تھا۔([13])

امام رازی کے نزدیک غیر مسلم ریاست میں عہدہ قبول کرنا جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے، بشرطیکہ مقصد عوامی مفاد اور فلاح ہو۔ اگر لوگوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ صرف منصب سنبھالنے سے ممکن ہو تو یہ عمل شرعی و عقلی فریضہ بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اعتراضات اسی وقت معتبر ہیں جب وہ عوام کے حقیقی مفاد کو نقصان پہنچائیں، ورنہ مقصد کی تقدس وسیلے کی جوازیت پر مقدم ہے۔ چنانچہ غیر مسلم حکومت میں بھی کوئی عہدہ اس وقت واجب ہو سکتا ہے جب اس کے ذریعے رزق، امن اور اجتماعی بھلائی کے مقاصد حاصل ہوں۔

عصرِ حاضر میں عالمی معاشرہ گہرے تغیر سے گزر رہا ہے۔ معاشی خوشحالی، روزگار اور تعلیم کے مواقع نے لاکھوں مسلمانوں کو غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت پر آمادہ کیا ہے۔ نتیجتاً مسلمان اقلیتیں نئے فقہی و تہذیبی چیلنجز سے دوچار ہیں: غیر اسلامی نظام میں دینی شناخت کا تحفظ، مقامی قوانین سے ہم آہنگی، اور خیر و فلاح کے مواقع کی تلاش جیسے سوالات اب مرکزی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔

اسی پس منظر میں علامہ راشد غنوشی کی فکر نمایاں ہوتی ہے۔ وہ زور دیتے ہیں کہ شریعت کے مقاصد اور روح کو پیشِ نظر رکھے بغیر جدید مسائل کا حل ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک انسانی فلاح، ظلم سے اجتناب اور خیر کے فروغ کو مرکز بنا کر مسلمانوں کو اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینی چاہیے۔ جدید دنیا میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ مسلمان غیر اسلامی معاشروں میں رہتے ہوئے بھی خیر، عدل اور انسانی وقار کے فروغ میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں ۔ یہی طرزِ عمل مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ ہے۔([14])

غنوشی اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بعض علما اب بھی اس رویے کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کے نزدیک غیر اسلامی فریم ورک میں کوئی تعاون یا اشتراک درست نہیں۔ لیکن وہ اس مؤقف پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ طرزِ فکر دراصل مسلمانوں کی عملی زندگی کو غیر ضروری طور پر مشکل بنا دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف تعمیری امکانات محدود ہوتے ہیں بلکہ ایسی جائز اور قانونی پالیسیوں پر پابندیاں لگ جاتی ہیں جن کا مقصد محض یہ ہے کہ مسلمان مشکل حالات میں بھی مثبت ردعمل دینے اور اپنے حقوق اور مفاد کے تحفظ میں فعال رہ سکیں۔([15])

شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م 728ھ/1328ء) ان علما میں سے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے اجتماعی و سیاسی کردار پر گہری بصیرت کے ساتھ گفتگو کی۔ وہ اپنے فتاویٰ میں یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ اگر کسی منصب کے قبول کرنے سے بڑے نقصانات روکے جا سکیں اور عدل یا بھلائی میں اضافہ

---

[12]- Fkẖrạldyn rạzy , taf̊sīra ạl̊fakẖ̊ru ạlrãạzīã ạl̊musẖ̊tahira biạltãf̊sīri ạl̊kabīri wamufātiḥi ạl̊gẖaẙbi , ạl̊juz̊ʾa ạl̊ạå̊wāla ,(̃byrwt: ̃dāru ạl̊fik̊ri lilṭ̊ībāʿaẗa wālnãsẖ̊ra wāltãẘzīʿa , 1981ʾ) 165 / 18
[13]- Fkẖrạldyn ̃rạzy , tafs̊īra ạl̊fakẖ̊ru ạlrãạzīã ạl̊musẖ̊tahira biạltãf̊sīri ạl̊kabīri wamufātiḥi ạl̊gẖaẙbi , 166 / 18
[14]- Azzam T̃amim̃i, ed. Power-Sharing Islam? P. 60
[15]- Ibid. P. 60

ہو، تو ایسا عہدہ سنبھالنا جائز بلکہ بعض اوقات واجب ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اقتدار بذاتِ خود غایت نہیں بلکہ وسیلۂ اصلاح ہے جس کے ذریعے ظلم کو کم اور انصاف کو زیادہ کیا جا سکتا ہے۔

ابن تیمیہ کے مطابق اگر حکام تمام منکرات ختم نہ کر سکیں لیکن دوسروں کی نسبت زیادہ خیر اور کم شر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو ان کا اقتدار اختیار کرنا شرعی تقاضا بن جاتا ہے۔ اسی سے جہاد، نظمِ اجتماعی، اموال کی منصفانہ تقسیم اور حدود اللہ کے نفاذ جیسے مقاصد ممکن ہوتے ہیں۔

وہ حضرت یوسفؑ کی مثال دیتے ہیں کہ ایک نبی نے غیر مسلم حکومت میں منصب قبول کیا تاکہ عوامی مفاد، عدل اور فلاح کو یقینی بنایا جا سکے۔ اگرچہ وہ دین کے تمام احکام نافذ نہ کر سکے، مگر اپنی طاقت کو خیر کے فروغ اور ظلم کے ازالے کے لیے بروئے کار لائے۔ (16)

ابنِ تیمیہ اسی قرآنی اصول کو نمایاں کرتے ہیں: "جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔" اس سے وہ یہ فقہی قاعدہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر دو شرعی ذمہ داریاں ایک ساتھ پوری نہ ہو سکیں تو زیادہ اہم فرض کی ادائیگی کافی ہے، اور دوسرے کے ترک پر مواخذہ نہیں۔ مسلمان کو اپنے اختیار اور صلاحیت کے مطابق یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا عمل زیادہ خیر پیدا کرتا اور بڑی برائی کو روکتا ہے۔

ان کے نزدیک مسلمانوں کی صلاحیتیں ذاتی مفاد نہیں بلکہ عوامی فلاح کے لیے ہیں؛ یہ اللہ کی امانت ہیں جن کا درست مصرف لازم ہے۔ لہٰذا کسی بھی معاشرے، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، میں اگر کسی منصب کے ذریعے انسانی مفاد، انصاف اور بھلائی کے مقاصد حاصل ہوں تو یہ عمل شرعاً جائز بلکہ کبھی واجب ہو جاتا ہے۔

آج دنیا کے بدلتے سیاسی حالات میں تقریباً ایک تہائی مسلمان اقلیتوں کے طور پر رہتے ہیں، جنہیں مذہبی و ثقافتی شناخت اور سیاسی شمولیت کے چیلنج درپیش ہیں۔ بعض علاقوں میں جبری انضمام اور ثقافتی دباؤ نے ان کی بقا خطرے میں ڈال دی ہے۔ ایسے میں سوال یہ ہے کہ فقہِ اسلامی ان اقلیتوں کو کیا رہنمائی دیتی ہے تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ معاشرتی طور پر فعال رہ سکیں۔

کچھ حلقے ہجرت کو حل سمجھتے ہیں، مگر معاشی و سیاسی رکاوٹیں اور مقامی وابستگیاں اسے غیر عملی بناتی ہیں۔ مزید یہ کہ اس سوچ سے اقلیتوں کے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے معاشروں سے بے دخلی کے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح الگ تھلگ رہنے کا مشورہ بھی اسلام کی اس تعلیم کے خلاف ہے جو مسلمانوں کو فعال، مثبت اور معاشرتی طور پر مربوط کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ (17) ان میں سے بڑے بڑے علما اسلام کے نظام حکومت کو قرآن مجید کی کلاسیکل عہد میں لکھی گئی تفاسیر کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس حوالے سے مختلف علما کے فکر کا جائزہ معروف محقق ہاشم کمالی لیتے ہیں۔ (18)

تاریخی خلافت کا نظام دراصل ولایت (عوامی اختیار) اور وکالت (نمائندگی) کے امتزاج پر قائم تھا، جہاں خلیفہ امت کا وکیل اور سیاسی نمائندہ سمجھا جاتا تھا، مگر اصل سیاسی اختیار کی مرکزیت اسی کی ذات میں مرتکز رہتی تھی۔ اسلامی نظامِ حکومت میں اختیارات کی تقسیم نہیں بلکہ ان کی تفویض کا اصول کارفرما تھا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں اسلامی فکر مغربی جمہوری نظریے سے جدا ہوتی ہے، کیونکہ جمہوریت میں طاقت کو مختلف اداروں میں بانٹ کر توازن پیدا کیا جاتا ہے، جب کہ اسلام میں طاقت کا ارتکاز اگر شریعت کے دائرے میں رہے تو اسے نظم و وحدت کا مظہر مانا جاتا ہے۔ اسلامی

16- Aiḥ̊mad̊ b̊n ʿab̊di ạlḥlym ạib̊na tymy , ftạwy ̇ sẖy̱kẖ ạlạslạm ạib̊na tymy̱ۂ ,(mdy̱nۂ mnwrۂ: maj̊maʿu ạlmlḵ fۂd llṭbạʿẗ ạ̊lmuṣ̊ḥafa ạlsẖãrīf̃a , 2004ʾ) 55 / 20

17- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? P. 60

18- Mohammad Hashim Kamali, Constitutionalism And Democracy: An Islamic Perspective, https://icrjournal.org/index.php/icr/article/view/678

حکمرانی کا یہ وحدانی تصور دراصل عقیدۂ توحید سے اخذ ہوتا ہے، جو نہ صرف ایمان بلکہ تمدنی و سیاسی نظم کی بھی بنیاد ہے۔ جس طرح خدا کی وحدانیت کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، ویسے ہی ریاست میں اختیارات کی وحدت نظم اور شرعی تسلسل کو ممکن بناتی ہے۔ اسی بناپر بعض علما مغربی طرزِ جمہوریت کو غیر توحیدی تصور سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ انسانی عقل پر تو مبنی ہے مگر الٰہی مرکزیت سے خالی۔ اسلام میں اقتدار کا سرچشمہ اللہ کی حاکمیت ہے، اور امت اس حاکمیت کی امین ہے، خود مختار قانون ساز نہیں۔ چنانچہ دین اور سیاست کی جدائی اسلامی فکر میں ممکن نہیں، کیونکہ شریعت فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں کی اخلاقی و قانونی اساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظم میں شورائیت کو بنیادی اصول مانا گیا ہے، مگر اسے جمہوریت کی اکثریتی رائے کے مترادف نہیں سمجھا جاتا۔ شوریٰ رہنمائی فراہم کرتی ہے، فیصلہ خلیفہ کی شرعی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جمہوری فلسفے میں اکثریت کی رائے ہی قانون سازی کا منبع بن جاتی ہے، جب کہ اسلامی تصور میں شریعت سے ماورا کوئی انسانی ادارہ خود مختار قانون ساز حیثیت نہیں رکھتا۔ کمالی کے نزدیک شریعت سے ماورا کسی انسانی ادارے کو خود مختار قانون ساز اتھارٹی نہیں کہا جا سکتا۔

۵۔ اختیارات کی تقسیم پر کمالی کا تنقیدی زاویہ

بعض علما کے نزدیک مغربی جمہوری ماڈل میں اختیارات کی تقسیم کے تصور کو ایک تاریخی و فلسفیاتی ردِعمل سمجھتے ہیں۔ جو کلیسا اور ریاست کی کشمکش، اور طاقت کے غلط استعمال کے خوف سے پیدا ہوا۔

اسلامی روایت میں چونکہ حاکمیتِ الٰہیہ اور اخلاقی احتساب کے اصول پہلے سے موجود ہیں، اس لیے یہاں اختیارات کی تقسیم کے بجائے ان کے شرعی نظم و توازن (balance through accountability) کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں قانون (شریعت) خلیفہ یا کسی ادارے سے بالاتر ہے، اس لیے طاقت کے غلط استعمال کا خطرہ اخلاقی و شرعی قیود کے ذریعے محدود کیا جاتا ہے، نہ کہ ادارہ جاتی علیحدگی کے ذریعے۔ (19)

مختصر یہ کہ اگر ان علما کے افکار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علمائے کرام اسلامی سیاسی فکر میں اختیارات کی تقسیم کے مغربی تصور سے اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔

ان کے نزدیک اسلامی نظامِ حکومت:

- وحدانی ہے، وفاقی یا پارلیمانی نہیں
- دین و سیاست کی نامیاتی وحدت پر قائم ہے، سیکولر تفریق پر نہیں
- شریعت کے تابع ہے، انسانی قانون سازی کے تابع نہیں
- اور شورائیت پر مبنی ہے، مگر جمہوری اکثریت کے تصور پر نہیں۔

یوں وہ اسلامی شورائی حکومت کا ایک ایسا تصور پیش کرتے ہیں جو مرکزی اختیار، شرعی قیادت، اور امت کی اخلاقی نمائندگی پر قائم ہے۔ یہی تصور ان کے نزدیک اسلامی حکمرانی کو جمہوریت سے ممتاز اور الگ کرتا ہے۔

درج بالا افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے ہاشم کمالی لکھتے ہیں کہ اگر تاریخی خلافت کو جائزے کی بنیاد بنایا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں اختیارات کی تقسیم کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے مفسرین نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اختیارات کی تقسیم اسلامی سیاسی فکر

---

19. Mohammad Hashim Kamali, Constitutionalism And Democracy: An Islamic Perspective, https://icrjournal.org/index.php/icr/article/view/678

کے لیے اجنبی ہے۔اس رائے کی ایک بنیاد ضرور موجود ہے، جیسا کہ میں آگے واضح کروں گا،اگرچہ میرے نزدیک یہ نتیجہ پوری طرح درست نہیں اور اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔([20])

اس اہم مسئلہ کے حوالے سے علامہ غنوشی ایک فکر پیش کرتے ہیں کہ ایک زیادہ معقول اور عصرِ حاضر سے ہم آہنگ متبادل یہ ہے کہ مسلمان اقلیتیں اپنے اصولی موقف پر قائم رہتے ہوئے ان گروہوں اور تحریکوں کے ساتھ اتحاد کریں جو سیکولر جمہوری اقدار کی بنیاد پر انسانی آزادی اور بنیادی حقوق کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔اس اتحاد کا مقصد اسلامی شناخت کو ترک کرنا نہیں بلکہ ایسے وسیع تر نظام کی تشکیل ہے جس میں سب شہریوں کو یکساں انسانی حقوق، آزادیِ ضمیر، مذہبی آزادی اور تحفظ کی ضمانت حاصل ہو۔اس سے نہ صرف اقلیتوں کو اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ وہ ان معاشروں میں خیر اور بھلائی کے فروغ میں بھی شراکت دار بن سکتے ہیں۔([21])

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی یہ حکمت عملی قابل جواز ہے کیونکہ اسلام کا بنیادی مقصد انسانی وقار، عدل، مساوات اور ظلم کے خاتمے کو یقینی بنانا ہے۔ شریعت کے مقاصد (مقاصد الشریعہ) انہی بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل پر زور دیتے ہیں، جن میں جان، مال، عزت، دین اور عقل کی حفاظت شامل ہے۔اگر مسلمان اقلیتیں سیکولر جمہوری ڈھانچے کے اندر رہ کر ان مقاصد کے تحفظ میں اپنا کردار ادا کریں تو یہ نہ صرف ایک فقہی تقاضے کی تکمیل ہوگی بلکہ اسلامی دعوت کی روح کے عین مطابق بھی ہوگا۔

یوں غنوشی کی یہ فکر ہمیں یاد دلاتی ہے کہ بدلتے ہوئے عالمی تناظر میں مسلمان اقلیتوں کے مسائل کو صرف ماضی کے فقہی سانچوں سے حل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اجتہادی بصیرت، مقاصدی فکر اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھنا لازمی ہے۔یہی وہ راستہ ہے جو مسلمانوں کو نہ صرف بقا بلکہ مثبت کردار اور عالمی سطح پر مؤثر موجودگی عطا کر سکتا ہے۔

سورۂ یوسف کے حوالے سے درج بالا تفاسیر اور ابن تیمیہ کی فقہی مبحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان اس پہلو سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اقتدار، سیاست اور سماجی خدمت کے بنیادی اُصولوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ان کے قصے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقتدار بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں بلکہ ایک وسیلہ ہے، اور یہ وسیلہ اسی وقت بامعنی ہے جب وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مقاصدِ شریعت کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔

اس حوالے عبید اللہ فہد فلاحی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی حکومت میں شرکت کا فیصلہ صرف ذاتی نجات یا وقتی فائدے کے لیے نہیں تھا بلکہ ایک بڑے مقصد کے تحت تھا، یعنی انسانی جانوں کو قحط اور تباہی سے بچانا، اور عدل و مساوات کو قائم کرنا۔اس پہلو سے اقتدار کو محض سیاسی لذت یا طاقت کے کھیل کے طور پر دیکھنا، جیسا کہ جدید جمہوری حکومتوں میں اکثر نظر آتا ہے، قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔اسلام میں اقتدار کی اصل روح خدمت، عدل اور خیر کے فروغ سے وابستہ ہے۔

قرآن نے یوسف علیہ السلام کی شخصیت کے چند بنیادی اوصاف کو اجاگر کیا ہے: مکین (یعنی بااختیار حیثیت رکھنے والا)، امین (یعنی اعتماد کے قابل)، حفیظ (یعنی بہترین نگہبان)، اور علیم (یعنی بصیرت و حکمت سے بہرہ ور)۔ یہ چاروں اوصاف کسی بھی سیاسی قیادت کے لیے ناگزیر شرائط کی

---

[20]- Mohammad Hashim Kamali, Constitutionalism And Democracy: An Islamic Perspective, https://icrjournal.org/index.php/icr/article/view/678

[21]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? P. 60

حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کی مسلم دنیا میں جب سیاسی بحران، بد عنوانی، اور قیادت کا فقدان سب سے بڑے چیلنجز بن چکے ہیں، تو یہ اوصاف رہنما اصول کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

عصری تناظر میں دیکھا جائے تو اقوام عالم کو دو بڑے مسائل کا سامنا ہے: ایک طرف سیاسی قیادت کا بحران ہے جہاں اقتدار ذاتی یا جماعتی مفادات کی تسکین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور دوسری طرف عالمی سطح پر انصاف اور انسانی فلاح کے اصول کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے ماحول میں قرآن کی یہ تعلیمات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اقتدار کی تقسیم یا شراکت اس وقت بامعنی ہے جب وہ شریعت کے اعلیٰ مقاصد یعنی انسانی فلاح، عدل، اور ظلم کے انسداد کے لیے وقف ہو۔(22)

مسلم سیاست دانوں اور رہنماؤں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اندر وہی صفات پروان چڑھائیں جو یوسف علیہ السلام کی شخصیت میں نمایاں ہوئیں۔ بصیرت و علم کی گہرائی، امانت و دیانت کی پختگی، اور معاشرتی خدمت کا جذبہ یہ سب مل کر اسلامی سیاست کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ اصول ہمارے سیاسی کلچر میں شامل ہو جائیں تو نہ صرف مسلم دنیا کے داخلی مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ایک مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر طہ جابر علوانی (1935-2016) اپنے فکری و علمی ورثے میں ایک نہایت اہم نکتہ پیش کرتے ہیں جو آج کے عالمی حالات میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عصرِ حاضر کے مسلم دانشور اور سیاسی سائنسدان محض ردِ عمل کی سیاست یا وقتی نعروں پر انحصار نہ کریں بلکہ تمام دستیاب فکری، علمی اور تحقیقی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے دو بڑے اہداف کو سامنے رکھیں۔

اول یہ کہ امتِ مسلمہ میں ایک فکری انقلاب برپا کیا جائے جو جمود، فرقہ واریت اور اندھی تقلید سے نجات دلا کر تنقیدی و تخلیقی سوچ کو فروغ دے۔ ایسا فکری انقلاب محض کتابی بحثوں تک محدود نہ ہو بلکہ تعلیم، ابلاغ، سماجی اداروں اور سیاسی ڈھانچوں تک اپنی جڑیں پھیلائے۔ دوم یہ کہ شریعت کے اصولوں اور اخلاقی بنیادوں پر مبنی حکومتی و سیاسی نظام کی مضبوط علمی اساس تیار کی جائے جو جدید ریاستی و بین الاقوامی نظام سے ہم آہنگ بھی ہو اور اسلامی مقاصدِ شریعت کو بھی پورا کرے۔(23)

یہ دونوں تقاضے محض نظریاتی سطح پر اہم نہیں بلکہ عملی سطح پر بھی نہایت ضروری ہیں۔ آج کی دنیا میں مسلمان اقلیتیں مغربی معاشروں میں اپنی شناخت کے بحران کا شکار ہیں، جبکہ مسلم اکثریتی ممالک داخلی انتشار، بد عنوانی اور سیاسی استحکام کے فقدان سے دوچار ہیں۔ ایسے حالات میں جب طاقتور عالمی قوتیں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہی ہیں، امتِ مسلمہ کے لیے اپنی شناخت کو بحال کرنا اور ایک مؤثر بین الاقوامی کردار ادا کرنا ناگزیر بن گیا ہے۔

علوانی کی فکر یہ واضح کرتی ہے کہ اگر امت اپنی فکری بنیادوں کو از سرِ نو تعمیر کرے اور شریعت کی روشنی میں ایک منظم اور فعال حکومتی و سیاسی ڈھانچہ وضع کرے تو وہ نہ صرف داخلی طور پر اپنی حالتِ زار کو بدل سکتی ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی ظالم قوتوں کے تسلط کو چیلنج کر سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں امت اس مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں وہ زمین پر عدل، توازن اور انسانی فلاح کو فروغ دینے والی قیادت فراہم کرے، بجائے اس کے کہ طاقت اور جبر کے ذریعے انسانیت پر اپنی برتری جتانے والوں کی پیروی کرتی پھرے۔ یہ تصور صرف ایک خواب نہیں بلکہ ایک عملی روڈمیپ ہے جسے اپنانے

22- Obaidullah Fahad, Redefining Islamic Political Thought: A Critique in Methodological Perspective, 1.

23- Taha Jabir Al-Alwani. "Political Science in the Legacy of Classical Islamic Literature." The American Journal of Islamic Social Sciences 7, no. 1 (1990): 11

کے لیے مسلم دنیا کے تعلیمی اداروں، تحقیقی مراکز، اور سیاسی قیادت کو مشترکہ طور پر آگے بڑھنا ہوگا۔ بصورتِ دیگر امت کی تجدید اور عالمی سطح پر اس کا مؤثر کردار محض نعرہ ہی رہ جائے گا۔ یوں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ محض ایک تاریخی روایت نہیں بلکہ عصرِ حاضر میں بھی قیادت، اقتدار اور شریعت کے مقاصد کے درمیان تعلق کو سمجھنے کا ایک زندہ اور قابلِ تقلید ماڈل ہے۔

تاریخِ اسلامی میں حضرت یوسفؑ کی مثال کے علاوہ ہجرتِ حبشہ بھی ایک اہم واقعہ کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی سالوں میں جب قریش کی ظلم و ستم کی شدت حد سے تجاوز کر گئی، تو نبی ﷺ نے اپنے کچھ اصحاب کو، جن پر شدید مظالم ڈھائے جا رہے تھے، حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی کو قرآن و سنت کے حوالے سے وہ عظیم حکمران قرار دیا گیا جس کے ملک میں کوئی مظلوم نہ ہو۔ مسلمانوں کی اس چھوٹی جماعت کی ایمانی اور اخلاقی موجودگی نے نجاشی کے دل کو متاثر کیا اور اسے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہونے پر مجبور کیا، حالانکہ اس نے اپنی حکومت میں شریعت کے نفاذ کی طرف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، کیونکہ ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی بادشاہی بلکہ مہمانوں کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ابن تیمیہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم یقین سے جانتے ہیں کہ وہ اپنی جماعت میں قرآن کے قانون کا نفاذ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے لوگ اجازت نہ دیتے۔ اس کے باوجود، نجاشی اور اس جیسے تمام لوگ اللہ کی رضا تک پہنچ گئے، اگرچہ وہ قوانین اسلام کی پابندی نہ کر سکے اور صرف موجودہ حالات میں قابلِ عمل اقدامات کر سکے۔([24])

یقیناً یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک روشن اور قابلِ تقلید مثال کے طور پر درج ہے اور آج بھی اخلاقی و سیاسی درس کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے نجاشی کی وفات پر ان کے لیے نمازِ جنازہ ادا فرمائی ([25]) جو مسلمانوں کے لیے وفاداری، احترام، اور اخلاقی ذمہ داری کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس عمل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی غیر مسلم حکمران کے تحت زندگی گزارنے کے دوران بھی عدل و انصاف، انسانی وقار اور سماجی بھلائی کے اصولوں کی پاسداری کریں۔ نبی ﷺ کے اس اقدام نے یہ بھی سکھایا کہ ایمانی کردار اور اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ ریاست کے قوانین اور آئین کا احترام کرنا، حتیٰ کہ غیر مسلم قیادت کے تحت بھی، معاشرتی استحکام اور عوامی بھلائی کو فروغ دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح، یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے عملی نمونہ فراہم کرتا ہے کہ کس طرح حق و انصاف اور وفاداری کو یکجا رکھتے ہوئے عالمی اور بین المذاہب معاشرتی تناظر میں زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

راشد غنوشی (Rached Ghannouchi) اس اہم فکری نکتہ پر روشنی ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے صرف اس وقت فعال سیاسی کردار اختیار کرنا جائز نہیں جب وہ مکمل طور پر اسلامی حکومت قائم کر سکتے ہوں، بلکہ ان پر یہ فریضہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسے نظام میں حصہ ڈالیں جو عقلی، معقول اور جمہوری اصولوں پر قائم ہو، خواہ وہ مکمل طور پر اسلامی نہ بھی ہو۔ وہ ایک بنیادی سوال اٹھاتے ہیں: اگر مسلمان کسی ملک میں اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنے کے قابل نہ ہوں، تو کیا وہ سیکولر یا غیر اسلامی جمہوری نظام میں شمولیت سے گریز کر سکتے ہیں؟ ان کے مطابق جواب واضح ہے: نہیں۔ مسلمانوں پر بطور افراد اور جماعت لازم ہے کہ وہ ایسے نظام کے قیام اور استحکام میں کردار ادا کریں، تاکہ شریعت کے براہِ راست نفاذ کے بغیر بھی، وہ معاشرتی انصاف، عدل و مساوات اور قانونی حکمرانی کے اصولوں کو فروغ دیں۔([26]) اس مؤقف سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

[24]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? London: Liberty for Muslim World Publications, 1993. P. 58
[25]- Iạmạm bkẖạry , ṣaḥīḥa ạlbkẖạry , kitāba manāqibi ạ̉lạå̉nṣāri , bāba maŵti ạlnjạsẖy , raq̊ma ạlḥdytẖ: 3881
[26]- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? London: Liberty for Muslim World Publications, 1993. P. 56

مسلمان اپنے عملی اور اخلاقی کردار کے ذریعے کسی بھی سیاسی و شہری نظام میں حصہ لے کر معاشرتی بھلائی اور نظم و نسق کی مضبوطی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں، چاہے وہ نظام مکمل طور پر اسلامی نہ ہو۔

اسلامی تاریخ میں حلف الفضول ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو مکہ کے قبائلی معاشرے میں ظلم و جبر کے انسداد اور مظلوم کی اعانت کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ اسلام سے قبل اس وقت طے پایا جب معاشرتی ناانصافیوں اور کمزور طبقات کے استحصال نے انسانی اقدار کو مجروح کر رکھا تھا۔ مختلف قبائل نے اس عہد کے تحت اس بات کا التزام کیا کہ وہ ظلم کا شکار ہونے والے ہر فرد کی مدد کریں گے، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کریں گے اور معاشرتی بھلائی کو یقینی بنانے کے لیے متحد ہوں گے۔

نبی اکرم ﷺ نے اس معاہدے میں بطور جوان براہِ راست شرکت فرمائی اور بعثت کے بعد بھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اسلام کے دور میں بھی ایسا کوئی معاہدہ پیش آتا تو وہ بلا تردد اس کا حصہ بنتے۔ مزید برآں آپ ﷺ نے یہ اصول بھی واضح کیا کہ جاہلیت میں کیے گئے وہ تمام معاہدات جن کی بنیاد خیر، انصاف اور انسانی خدمت پر ہو، اسلام انہیں رد نہیں کرتا بلکہ اپنی تائید عطا کرتا ہے۔(27)

یہ رہنمائی آج کے زمانے کے لیے نہایت غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ عصرِ حاضر کا عالمی معاشرہ مختلف تہذیبوں، مذاہب اور نظریات کا ایک پیچیدہ امتزاج ہے جہاں تعلقات، معاہدات اور اتحاد ناگزیر ہو چکے ہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی اس بصیرت افروز سنت سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنی حکمتِ عملی اسی روشنی میں طے کریں۔ اس سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ مسلمان، خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، ایسے اجتماعی معاہدات اور اتحادوں میں بھرپور حصہ لے سکتے ہیں جن کا مقصد ظلم کا خاتمہ، انسانی حقوق کا تحفظ، معاشرتی انصاف کا قیام، عوامی اختیار کا احترام اور طاقت کی پرامن تقسیم کو ممکن بنانا ہو۔ یہ شرکت اس وقت بھی قابل قدر اور دینی طور پر جواز رکھتی ہے جب معاہدے کے دوسرے فریق اسلام یا مسلمانوں کے نظریات سے متفق نہ ہوں، کیونکہ عدل و خیر کی جدوجہد اپنی اصل میں آفاقی ہے اور انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔(28)

معاصر اسلامی مفکرین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد انسانی برابری، اجتماعی مشاورت اور ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کے اصول پر استوار ہے۔ اس نظام میں ہر شہری، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، یہ حق رکھتا ہے کہ وہ ریاستی امور میں اپنی رائے دے، اپنی آرا و افکار کو پُرامن ذرائع سے پیش کرے اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرے۔(29) یہی اصول قرآن کی اس آیت میں جھلکتا ہے: ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (30) یعنی ہر فرد کو اپنے موقف اور عقیدے پر قائم رہنے کا حق حاصل ہے۔ یہ آیت آزادیِ رائے اور ضمیر کی آزادی کو ایک بنیادی اصول کے طور پر پیش کرتی ہے، جو اجتماعی نظم و نسق میں بھی اپنی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ اسلامی کلاسیکی فکر میں خواتین یا دیگر مفاداتی گروہوں کے کردار پر تفصیلی مباحث موجود نہیں، لیکن عملی زندگی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو ان کے مؤثر کردار کو واضح کرتی ہیں۔ سیرتِ نبویؐ میں ہمیں وہ واقعہ ملتا ہے جب ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور مطالبہ کیا کہ خواتین

27- Imạm muŝlimu^{n} , ṣaḥīḥa muŝlima , ḵtạb ạlạymạn , bāba bayāni ḥḵm ʿamala ạlḵạfr ạiḏḏā ạ̊ŝlumi^{n} baʿdahu , raq̊mu^{n}: 123 , 113 / 1
28- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? P. 58
29- Ibid. P. 86
30- Aȋqurāạˆn 109: 6

کے لیے علیحدہ وقت مقرر کیا جائے تاکہ وہ تعلیم اور دین کی معرفت حاصل کر سکیں۔([31]) یہ قدم اس بات کی علامت تھا کہ خواتین اپنی تعلیم اور اجتماعی شعور میں فعال کردار ادا کرنے کی خواہاں تھیں۔

اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں جب انہوں نے عورتوں کے مہر کی حد مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو ایک خاتون نے کھڑے ہو کر اس فیصلے پر اعتراض کیا اور قرآن سے استدلال کیا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً اس رائے کو تسلیم کیا اور اپنے فیصلے سے رجوع کر لیا۔([32]) یہ مثال اس امر کی غماز ہے کہ خواتین نہ صرف رائے دہی کے حق کی حامل تھیں بلکہ عملی طور پر فیصلہ سازی کے عمل میں ان کی رائے کو وزن بھی دیا جاتا تھا۔ گویا وہ ایک غیر رسمی پریشر گروپ کی حیثیت سے اثر انداز ہوتی رہیں۔([33])

معاصر دور میں یہ بحث مزید آگے بڑھتی ہے۔ علماء اور مفکرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ٹریڈ یونینز، خواتین کی انجمنیں، اساتذہ کی تنظیمیں اور طلبہ کے یونین جیسے گروہ اجتماعی سماجی و سیاسی اقدامات میں ثالثی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ گروہ محض ذاتی مفادات کے بجائے اجتماعی فلاح کے ترجمان ہوں تو اسلامی سیاسی نظام میں ان کے وجود کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا جانا چاہیے۔([34]) ان کے ذریعے رائے عامہ کی تشکیل اور ترسیل بہتر انداز میں ممکن ہوتی ہے، اور فیصلہ سازی میں معاشرے کے مختلف طبقات کی آواز شامل ہو جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نقطہ نظر اس حوالے سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خواتین کے بارے میں کوئی بھی قانون، خواتین کی نمائندہ انجمن یا تنظیم سے مشاورت کے بغیر نافذ نہیں ہونا چاہیے۔([35]) ان کے نزدیک خواتین کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی آواز براہِ راست فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کی جائے۔ اس سے ایک طرف خواتین کو اپنے حقوق کے بارے میں زیادہ شعور حاصل ہو گا اور دوسری طرف مردوں کے یک طرفہ فیصلوں کا راستہ بند ہو گا، جو اسلامی انصاف اور مساوات کے اُصول کے منافی ہے۔

آج جب دنیا بھر میں خواتین کی شمولیت کو پائیدار ترقی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے، اسلامی سیاسی فکر اس سلسلے میں کوئی اجنبی یا متضاد تصور پیش نہیں کرتی۔ بلکہ تاریخِ اسلام کی روشن مثالیں اور معاصر مفکرین کی آرا یہ ظاہر کرتی ہیں کہ خواتین کا کردار محض محدود خانگی زندگی تک نہیں بلکہ ریاستی اور اجتماعی معاملات میں بھی ناگزیر ہے۔ اس وقت جب مسلمان معاشرے مغربی جمہوری ڈھانچوں میں ضم ہو رہے ہیں یا کثیر الثقافتی معاشروں کا حصہ ہیں، خواتین کی شمولیت کو نظر انداز کرنا خود اسلامی سیاسی فکر کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔

اختیارات کی شراکت اسلامی سیاسی فکر کی بنیاد ہے اور اس سے خواتین کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔ کلاسیکی اور معاصر علماء کی آرا اور جدید جمہوری معاشروں کی ضروریات یہ واضح کرتی ہیں کہ خواتین نہ صرف فعال سماجی اکائی ہیں بلکہ فیصلہ سازی میں شراکت کے بغیر شریعت کے مقاصد مکمل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اسلامی معاشروں کو خواتین کی سیاسی و سماجی شرکت کو تسلیم کر کے انہیں باوقار کردار دینا چاہیے تاکہ عدل، مشاورت اور شراکت کے اصول برقرار رہیں۔

---

[31]- Imạm bkẖạrỹ , ṣḥỹḥ ạlbkẖạrỹ , ḵtạb ạl̊ʿil̊ma , bābuⁿ hal̊ yaj̊ʿalu lilnĩsāʾi yaŵmuⁿ ʿalay̱ ḥadãẗiⁿ fī ạl̊ʿil̊mi , ḥdỹtẖ nmbr101

[32]- Iib̊na ḵtẖyr , ḥāfaẓa ʿimādu ạldyn ạib̊wi ạl̊fidāʾa , tfsyr ạib̊na ḵtẖyr , trjmہ: khẖṭỹb ạlہnd mawãlānā muḥamãdu jawĩnā gڑھy̰ (lạہwr: mak̊tabaẗu qad̃ũwsīãẗu ạurdw bāzārũⁿ , 2006ˀ)/ ̃4 562 -

[33]- Azzam T̃amimi, ed. Power-Sharing Islam? P. 86

[34]- Ibid. P. 86

[35]- Abul Ala Maududi, Al-Hukumah al-Islamiyah, op, cit. P. 273

اسلام ایک ایسی رفاہی وعادلانہ ریاست کا تصور پیش کرتا ہے جو صرف مذہبی رسومات تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔اس ریاست کی تعمیر و ترقی میں مرد وزن دونوں کی شراکت شرعی فریضہ ہے۔ شریعت کے مقاصد (مقاصد الشریعۃ) کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کا مقصد ہر اس امر کو شامل کرنا ہے جو انسانی فلاح (الفلاح) اور پاکیزہ زندگی (الحیاۃ الطیبۃ) کے قیام کے لیے ضروری ہو، بشر طیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہو۔امام غزالیؒ نے بجا طور پر وضاحت کی ہے کہ شریعت کا اصل مقصد لوگوں کی بھلائی ہے، اور یہ بھلائی ان کے دین، جان، عقل، مال اور نسل کی حفاظت میں مضمر ہے۔([36]) جو چیز ان پانچوں کی حفاظت کو یقینی بنائے وہی مصلحتِ عامہ اور شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

معاصر اسلامی مفکر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس حقیقت کو مزید نمایاں کیا ہے کہ آج کے پیچیدہ حالات میں فقہ التوازن، یعنی مفادات کے درمیان توازن اور ان کے اثرات کو سمجھنا اور قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔اسی تناظر میں اختیارات کی تقسیم اور قانونی و سیاسی توازن اس بات کی ضمانت فراہم کرتے ہیں کہ کوئی مفاد دوسرے پر ناجائز طور پر غالب نہ آئے بلکہ مصلحتِ عامہ کو ترجیح دی جائے۔([37])

تاریخ کے شواہد یہ بتاتے ہیں کہ اسلام نے اصولی طور پر ایسے حالات میں بھی شرکت کو جائز قرار دیا ہے جہاں حکومت خالص اسلامی نہ ہو، بشر طیکہ اس کا مقصد بھلائی کو فروغ دینا اور برائی سے بچنا ہو۔یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہؒ کا یہ قول آج بھی راہنما ہے کہ:

(إِنَّ اللهَ يُقِيمُ الدَّوْلَةَ الْعَادِلَةَ وَإِنْ كَانَتْ كَافِرَةً، وَلَا يُقِيمُ الظَّالِمَةَ وَإِنْ كَانَتْ مُسْلِمَةً)([38])

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایک عادل (انصاف پر قائم) ریاست کو باقی رکھتا ہے، چاہے وہ کافر ہو، لیکن ایک ظالم ریاست کو باقی نہیں رکھتا، چاہے وہ مومن ہو۔

اسلامی ریاست کا تصور بنیادی طور پر عدل، مصلحتِ عامہ اور اختیارات کے توازن پر مبنی ہے؛ اس تناظر میں طاقت کی شراکت (power-sharing) شمولیت، شہری حقوق اور سماجی استحکام کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے، بشر طیہ اس کی بنیاد الشوری اور امت کی حاکمیت پر ہو۔ فقہی اصولِ تضاد میں مفادات میں ترجیح اور برائیوں میں ارتکابِ اخفّ الضرّین یعنی کم تر ضرر کو اختیار کرنا معتبر ہے، اور یہی گزارہ فقہِ توازن (جیسا کہ یوسف القرضاوی نے بیان کیا) کی بنیاد ہے۔اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مبہم یا غیر اسلامی سیاسی ڈھانچوں میں شرکت بذاتِ خود ناجائز نہیں، بلکہ جب اس کا مقصد ظلم کا سدِ باب، عدل کا قیام اور عوامی فلاح ہو تو محدود، مقصدی اور حکمت آمیز تعاون شرعی طور پر جائز اور بعض اوقات ضروری ہے؛ البتہ یہ تعاون مستقل غایت نہیں بلکہ ایک عبوری حکمتِ عملی ہونی چاہیے، تاکہ داخلی استحکام، اجتماعی عدل اور شریعت کے مقاصد کے فروغ کا راستہ ممکن بنایا جاسکے۔ شریعتِ اسلامی کا بنیادی منشا یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی کو سہولت اور آسانی پر قائم کیا جائے، نہ کہ اسے سختی اور دشواری میں مبتلا کیا جائے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود رحمت اور حکمت سے واضح کر دیا ہے کہ دین کا مقصد تنگی نہیں بلکہ آسانی ہے۔قرآن میں ارشاد ہے:

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔'' ([39])

مزید فرمایا: ''اُس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''([40])

اسی طرح سورہ مائدہ میں آیا: ''اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔([41])

---

[36]- Imạm ạiƃwi ḥāmida ạlgẖzạly , ạlmstṣfy miń ʿiḻmi ạḻạủṣwli ,/ 1 174

[37]-Yusuf al-Qaradhawi (1998). Priorities of the Islamic Movement in the Coming Phase. Cairo: Dar al-Nashr, p.33.

[38]- Aiḥmaḍ ƃn ʿaƃdi ạlḥlym ạiƃna tymy , ftạwy sẖykẖ ạlạslạm ạiƃna tymy̱ہ (mdy̱nہ mnwrہ: maǰmaʿu ạlmlḵ fہd liṭibāʿaẗa ạḻmuṣḥafi ạlsẖãrīfi , 2004) 55 / 20

[39]- Aḻqurãạˆn 2: 185

[40]- Aḻqurãạˆn 22: 78

[41]- Aḻqurãạˆn 5: 6

نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے طرزِ عمل اور تعلیمات سے اسی اصول کو اجاگر کیا۔ روایت میں آتا ہے کہ ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں، جب رسول اللہ ﷺ اپنے کسی صحابی کو کسی کام پر مبعوث فرماتے تو آپ ﷺ فرماتے: (بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا)([42])
(لوگوں کو اجر و ثواب کی) خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا اور آسانی پیدا کرنا تنگی پیدا نہ کرنا۔

یہ ہدایت دراصل قیادت کے اس بنیادی اصول کو اجاگر کرتی ہے کہ اسلامی قیادت اپنی سیاسی و سماجی حکمتِ عملی میں سہولت، اعتدال، اختیارات کی شراکت اور خیر کے فروغ کو ہمیشہ مقدم رکھے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں اختیارات کی تقسیم: وہبہ الزحیلی کا جمہوری تقابل

یہ امر واضح ہے کہ اسلامی سیاسی فکر میں اختیارات کی تقسیم (separation of powers) ایک نہایت اہم موضوع ہے، خصوصاً جب اس کا موازنہ مغربی جمہوری اصولوں سے کیا جائے۔ اس سلسلے میں معاصر اسلامی مفکر ڈاکٹر وہبہ الزحیلی (وفات: 2015ء) کا مؤقف نہایت متوازن اور فکری طور پر پختہ ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلامی نظامِ حکومت میں بھی، اپنی مخصوص روحانی و قانونی بنیادوں کے ساتھ، اختیارات کی تقسیم کا ایک اصولی تصور موجود ہے اگرچہ اس کی نوعیت مغربی فلسفے سے مختلف ہے۔

ا۔ اسلامی قانون سازی کا ادارہ جاتی استقلال

وہبہ الزحیلی کے نزدیک اسلامی نظامِ حکومت میں قانون سازی (legislation) کا اختیار کسی فرد یا ریاستی سربراہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اسلامی قانون کی بنیادیں قرآن، سنت، اجماع اور اجتہاد پر استوار ہیں، اور ان ذرائع کا کسی حکمران یا امام سے کوئی انحصاری تعلق نہیں۔

اسلامی ریاست میں امام یا خلیفہ شریعت کا پابند ہے، خالق نہیں۔ وہ قانون کا تابع (law-bound authority) ہے، نہ کہ قانون ساز (law-maker)۔ یوں اسلام میں قانون، انتظامیہ سے آزاد اور اس پر بالادست ہے۔ یہ وہی اصولی نکتہ ہے جو وہبہ الزحیلی کے نزدیک اسلام کو آمریت سے الگ اور جمہوریت کے قریب لاتا ہے۔

۲۔ "اختیارات کی تقسیم" کی اسلامی تعبیر

الزحیلی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام اور مغربی جمہوریت دونوں استبداد (despotism) کی مخالفت کرتے ہیں اور عوام کو اختیار کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ تاہم، اسلام میں 'اختیارات کی تقسیم' مغرب کے طرز کی ادارہ جاتی علیحدگی نہیں بلکہ شرعی دائرہ کار میں متعین ذمہ داریوں کا نظام ہے۔
اسلامی ریاست میں:

- قانون سازی شریعت کے مصادر سے مشروط ہے۔
- انتظامیہ شریعت کے مطابق عمل کی پابند ہے۔

عدلیہ شریعت کے اصولوں کی روشنی میں فیصلے صادر کرتی ہے۔

[42]- Imam tibrazi, Mishkaat ul masabeeh, kitab ul imarat wal qazah, Fazilat al Hakim Al Adil, Raqim ul Hadees: 3722

یوں ہر ادارہ اپنے دائرے میں آزاد ضرور ہے مگر شرعاً مقید بھی ہے۔ یہ تقیید (restriction) انسانی خود مختاری نہیں بلکہ الٰہی قانون کی بالادستی کو یقینی بناتی ہے۔ اس سطح پر اسلامی نظام اور جمہوری فلسفے میں ایک اخلاقی مماثلت پیدا ہوتی ہے: دونوں اختیارات کے انضمام کے بجائے، ان کی توازن پذیر تقسیم کے قائل ہیں۔

۳۔ امام (سربراہِ مملکت) کا کردار

وہبہ الزحیلی امام کے کردار کو خاص طور پر تنفیذی اور خادمانہ نوعیت کا قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق امام کی ذمہ داری شریعت کے احکام کا نفاذ اور ان کے تقاضوں کی تکمیل ہے، نہ کہ ان میں ترمیم یا تغیر کرنا۔

امام کو نہ تو قانون میں اضافہ کا حق ہے، نہ اس کی تعبیر میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیلی کا۔ اس طرح اسلامی سیاسی ڈھانچے میں امام کے اختیارات حدودِ شریعت سے منضبط رہتے ہیں، جو آمریت کے امکان کو ختم کر دیتے ہیں۔

۴۔ اجماع اور عوامی رائے کا تعلق

وہبہ الزحیلی اجماعِ امت کے اصول کو اسلامی نظام میں عوامی رائے (popular will) کی علامت قرار دیتے ہیں۔ جس طرح جمہوریت میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے قانون سازی میں حصہ لیتے ہیں، اسی طرح اسلام میں اہلِ علم اور اہلِ حل و عقد کے اجماع کے ذریعے امت کی اجتماعی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ تصور اگرچہ ادارہ جاتی لحاظ سے جمہوریت کے نمائندہ نظام سے مختلف ہے، مگر فکری لحاظ سے عوامی شرکت اور اجتماعی مشاورت (collective consultation) کا ایک اسلامی نمونہ پیش کرتا ہے۔

۵۔ اسلام، آمریت اور جمہوریت کا موازنہ

وہبہ الزحیلی کا مرکزی استدلال یہ ہے کہ اسلام آمریت (authoritarianism) سے اصولی طور پر الگ ہے، کیونکہ اسلامی قانون کسی فرد یا طبقے کی من مانی پر قائم نہیں بلکہ الٰہی وحی اور اجتماعی اجتہاد پر مبنی ہے۔

اسلامی حکومت میں حاکم شریعت کا پابند ہوتا ہے، جب کہ جمہوریت میں قانون عوام کی مرضی سے بنتا ہے۔ اس لحاظ سے، اسلام جمہوریت سے مختلف ضرور ہے، مگر اس کے ساتھ اس کی ایک اخلاقی قربت ضرور ہے۔ دونوں ہی استبداد کے مخالف اور اجتماعی رضامندی کے قائل ہیں۔

مجموعی طور پر وہبہ الزحیلی کا نظریہ یہ واضح کرتا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں اختیارات کی تقسیم کا تصور کسی مغربی تقلید کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلامی شریعت کی فطری ساخت کا حصہ ہے۔

اسلام قانون کو الٰہی سرچشموں سے منسلک کر کے اسے انسانی اقتدار سے آزاد کرتا ہے، اور اس طرح سیاسی طاقت کو اخلاقی و شرعی حدود میں مقید رکھتا ہے۔ یہی وہ اصولی موقف ہے جو وہبہ الزحیلی کے نزدیک اسلام کو نہ صرف آمریت سے الگ بلکہ جمہوریت کے قریب بھی لاتا ہے۔ البتہ اس قربت کی بنیاد شریعت کی حکمرانی (Rule of Sharia) ہے، نہ کہ عوام کی حاکمیت (Sovereignty of the People)۔[43]

[43]- Wahbah al-Zuhaylī, Qaḍāyā al-fiqh wa ’l-fikr al-islāmī (Damascus: Dār al-Fikr, 2006), 466

اس پوری بحث سے مسلم معاشروں کے لیے یہ رہنمائی نکلتی ہے کہ اگر وہ ایسے حالات میں ہوں جہاں فوری طور پر اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہ ہو، تو ان کے لیے دانش مندی کا راستہ یہ ہے کہ وہ ایسی سیاسی قوتوں کے ساتھ اختیارات کی شراکت یا اتحاد کریں جو جمہوری بنیادوں پر انسانی حقوق کا تحفظ کرتی ہوں، جان و مال کے دفاع کو یقینی بناتی ہوں، اور عقیدے و اظہار کی آزادی کی ضمانت فراہم کرتی ہوں۔ اس طرح نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی بقا محفوظ رہتی ہے بلکہ عدل اور خیر کے فروغ کے مواقع بھی بڑھتے ہیں۔

تیونس کے ممتاز مفکر راشد غنوشی اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ اسلامی حکومت کا قیام ایک طویل المدتی اور حتمی ہدف ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اسلامی تحریکیں قومی یا غیر اسلامی سیاسی جماعتوں کے ساتھ وقتی بنیادوں پر اشتراک نہ کریں۔ ان کے مطابق، بشرطیکہ یہ شراکت انسانی فلاح اور عدل کے فروغ کے لیے ہو، تو اسے مقاصدِ شریعت کے دائرے میں شمار کیا جانا چاہیے۔(44) گویا اسلام کی قیادت کو اتنی حقیقت پسند اور لچک دار ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کے نفاذ سے براہِ راست وابستہ نہ رکھنے والی جمہوری قوتوں کے ساتھ بھی وقتی اور حکمتِ عملی کے تحت اشتراک کرے، تاکہ اعلیٰ مقاصدِ اسلام تدریجاً آگے بڑھ سکیں۔

اسلام کی اصل تعلیمات اسی حقیقت کو مزید مستحکم کرتی ہیں کہ انسانیت کی وحدت، کثرت اور تنوع کو تسلیم کیا جائے۔ یہی وہ آفاقیت ہے جو صوفیانہ فکر میں بھی جھلکتی ہے، اور جس کی بنیاد براہِ راست قرآن میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"انسانیت ایک ہی اُمت تھی، پھر اللہ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات میں فیصلہ کرے۔"(45)

اسی سورہ میں مزید کہا گیا:

"اور انہوں نے کہا کہ جنت میں وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہوگا، یہ ان کی اپنی خواہشات ہیں۔ کہہ دو کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ کیوں نہیں، جو بھی اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ نیکوکار ہو، اس کے لیے اس کے رب کے ہاں اجر ہے۔"(46)

مزید سورۃ الحج میں آیا: "ہر اُمت کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک طریق مقرر کیا جس کی وہ پیروی کریں۔" (47)

اور سورۃ المائدہ میں فرمایا: "اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن اس نے تمہیں آزمانے کے لیے وہ راہیں دیں جو اس نے تمہیں عطا کیں، پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لو۔" (48)

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مذہبی و تہذیبی تنوع انسانی معاشرے کی ایک الٰہی سنت ہے، جو خیر اور اصلاح کے لیے ہے نہ کہ فساد کے لیے۔ اسی اصول سے سیاسی رہنمائی یہ نکلتی ہے کہ جب اسلامی حکومت فوری طور پر قائم نہ ہو، تو مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ غیر اسلامی یا قومی سیاسی قوتوں کے ساتھ اختیارات کی شراکت کریں جو انسانی حقوق، آزادی اور عدل میں شریک ہوں۔ اسلامی قیادت کو عملی بصیرت اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وقتی تعاون قائم کرنا چاہیے تاکہ بڑے مفادات محفوظ رہیں۔ مزید یہ کہ مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں شورائی کمیٹیاں قائم کی جائیں جو داخلی و خارجی حالات کو دیکھ کر فیصلے کریں اور اختیارات کی شراکت کو منظم کریں۔ اس طرح قرآن و سنت کا پیغام واضح ہے کہ انسانیت ایک ہے، مگر شریعت اور تہذیب کے تنوع کو اللہ تعالیٰ نے خیر اور سبقت کے موقع کے طور پر رکھا ہے، اور اسلامی معاشروں کو اسی فکری بنیاد پر اپنی سیاسی حکمتِ عملی ترتیب دینی چاہیے۔

44- Azzam Tamimi, ed. Power-Sharing Islam? P. 49
45- Alqurãạˆn 2: 213
46- Alqurãạˆn2: 111 -112
47- Alqurãạˆn 22: 67
48- Alqurãạˆn5: 48

عصر حاضر میں قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کی تفصیل اس امر کی روشن گواہی ہے کہ ان کا تکثیری اور ہمہ گیر طرزِ عمل نہ صرف قابلِ تحسین بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ان کی حکمتِ عملی نے یہ اصول واضح کر دیا کہ اقتدار و سیاست کے میدان میں شمولیت، اگر خیر کے فروغ اور فساد کے ازالے کے لیے ہو، تو وہ دینی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ جو صورتحال حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد میں پیش آئی، وہ کسی بھی دور میں مسلمانوں کے لیے پیش آسکتی ہے۔ایسے حالات میں سیاسی اشتراک اور عملی حصہ داری سے گریز امت کے مفادات کو زوال اور سماجی برائیوں کے غلبے کی طرف لے جاسکتا ہے۔

یہی وہ فکری نکتہ ہے جسے عبید اللہ فہد فلاحی معاصر سیاسی تناظر میں مزید وسعت دیتے ہیں۔ان کے نزدیک اسلام میں اختیارات کی شراکت محض ایک سیاسی حکمتِ عملی نہیں بلکہ قرآنی تصورِ عدل اور انسانی وقار کے تسلسل کا حصہ ہے۔وہ زور دیتے ہیں کہ معاصر اسلامی تحریکوں پر لازم ہے کہ وہ مقاصد الشریعہ کی روشنی میں ایسے سماجی و سیاسی اتحاد اور اشتراکِ عمل کی بنیاد رکھیں جو نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ، آزادی اور عزتِ نفس کی ضامن ہو بلکہ انسانیت کی وحدت، عدل اور باہمی احترام کے قرآنی اصولوں کو بھی زندہ کرے۔[49]

یوں حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ اقتدار میں شمولیت، اگر اخلاقی مقاصد کے تابع ہو، تو وہ عین عبادت بن جاتی ہے۔اسلام کا آفاقی پیغام ہمیں دعوت دیتا ہے کہ سہولت، عدل، فلاح، اختیارات کی منصفانہ تقسیم اور انسانی وقار کو ہر سطح پر بنیادی اصول کے طور پر قائم رکھا جائے، اور سیاست و سماج کے تمام نظاموں کو مقاصد الشریعہ کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ یہی وہ توازن ہے جو اسلامی شوریٰ اور جدید جمہوریت کے باہمی تعلق کو فکری و اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے، اور امتِ مسلمہ کو عصرِ حاضر کی سیاست میں ایک مثبت، اخلاقی اور اصولی کردار ادا کرنے کی سمت دکھاتا ہے۔

This work is licensed under an Attribution-ShareAlike 4.0 International (CC BY-SA 4.0)

[49]- Obaidullah Fahad, Redefining Islamic Political Thought: A Critique in Methodological Perspective, 137.